قسط: ۲۳

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے:

برصغیر پاک وہند کی تعلیمی زندگی میں سب سے اہم مرحلہ کالج کی زندگی ہے۔ تقریریں، مباحثے، میچ وغیرہ سب مل کر اس زندگی کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ کالج لائف میں ہم نے مستقبل کے بارے میں بہت سے خواب دیکھے تھے۔ ان خوابوں کی مثالی دنیا تک ہمارے رہنمائی اسی کالج کی زندگی نے کی تھی۔ ہم نے ساری زندگی جن اصولوں اور آدرشوں کے تحت بسر کی ہماری طبیعت میں اسی زمانے میں راسخ ہوئے تھے۔ لائل پور کے کاٹن ملز میں ہونے والے مشاعرے بھی میری زندگی کے اس سہانے دور کا حصہ ہیں۔

لائل پور کاٹن ملز ایک ہندو لالہ مرلی دھر شاد کی ملکیت تھی وہ خود بھی اچھا شاعر تھا، ہر سال دو مشاعرے کراتا تھا۔ ایک مشاعرہ تو کاٹن ملز کی گراؤنڈ میں ہوتا جس میں عوامی طور پر شرکت کی اجازت ہوتی۔ اور اس کے بعد دوسرے روز وہ دوسرا مشاعرہ بھی کراتا جس میں عام لوگوں کا داخلہ ممنوع ہوتا تھا۔ میں دونوں مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ پہلی قسم میں تو مجھے کوئی دقت نہ ہوتی لیکن دوسرے مشاعرے میں شرکت کے لیے کسی قدر تگ ودو کرنا پڑتی لیکن میں اس تگ ودو میں ہر سال کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس مشاعرے میں پاکستان کے علاوہ بھارت کے بھی شاعر حضرات شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان سے اس وقت اردو کا سب سے بڑا شاعر فراق گورکھپوری اس مشاعرے میں شرکت کرتا اس کے علاوہ جگن ناتھ آزاد کا نام بھی مجھے یاد ہے اور پھر علامہ انور صابری بھی تشریف لے آتے اُن سے ملتا اور دہلی میں ان کی زیارت کی یادیں تازہ کرتا۔ پاکستان کے جن شاعروں کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں اُن میں جگر مراد آبادی سب سے بڑا نام ہے۔ جن کے علاوہ احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور ایک نام ساحر صدیقی کا ہے۔ زہرہ نگاہ کی اُس دور میں بڑی شہرت تھی وہ ترنم سے پڑھتی اور محفل پر چھا جاتی تھیں۔ ہمارے استاد محترم شور علیگ بھی شرکت کرتے، ایک دفعہ وہ روٹھ کر بن پڑھے ہی واپس چلے آئے تھے۔ شور صاحب کا نام بلایا گیا انہوں نے سٹیج پر پہنچنے میں تاخیر کی۔ نقیب انتہائی تیز طرار تھے، کافی بولتے تھے اُنہوں نے کہیں لوگوں سے کہہ دیا کہ جب تک آپ لوگ شور نہیں مچائیں گے شور صاحب سٹیج پر کلام سنانے نہیں آئیں گے۔ بس پھر کیا تھا۔ شور علیگ صاحب ناراض ہو کر گھر چلے آئے۔ دوسرے دن میں نے ان سے کلاس کے بعد پوچھا تو غصے میں کہنے لگے:

''وہ مرلی دھر شاد سیٹھ ہوگا تو اپنے گھر ہوگا میں کچھ اس سے مانگنے جاتا ہوں۔''

اب میں شور صاحب سے یہ نہ کہہ سکا معاملہ تو نقیب کا تھا غصہ آپ سیٹھ پر نکال رہے ہیں، بہرحال ایسے مشاعرے دوبارہ زندگی بھر نہیں دیکھے۔

ساحر صدیقی جھنگ سے تعلق رکھتے تھے، درزی تھے۔ لباس کو دیکھ کر آدمی یہی سمجھتا تھا کہ کوئی مانگنے والا فقیر ہے۔ لیکن اُن کی شاعری مشاعرے میں وہ رنگ جماتی کہ سامعین کسی غیر مرئی بندھن میں جکڑے جاتے یوں محسوس ہوتا کہ کسی نے کوئی افسوں پھونک دیا ہو۔ اُن سے بڑے شاعروں کو وہ داد نہ ملتی جو داد اُن کے حصے میں آتی۔ ترنم میں ڈوب کر پڑھتے اور سماں باندھ دیتے۔ اُن کی غزلوں کے چند اشعار مجھے آج تک یاد ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

عقل جب ہوش سنبھالے تو بنے جذبہ عشق
عشق جب رنگ پہ آتا ہے جنوں ہوتا ہے
لاکھ سمجھاؤ مگر جاتا ہے اُسی سمت خیال
کتنا کافر تیری یادوں کا فسوں ہوتا ہے

اور ساحر نے اپنی ایک غزل کا یہ شعر جب پڑھا تو مجھے یاد ہے کہ حاضرین کا سارا مجمع وجد کی کیفیت میں آ گیا تھا شعر تھا:

اجازت ہو تو آنکھوں میں چھپا لوں
زمانے کی نظر اچھی نہیں ہے

قتیل شفائی کی غزل کے اشعار کچھ ایسے تھے:

خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں
جب بھی آتا ہے میرا نام تیرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

احمد ندیم قاسمی کے چند اشعار جو محفوظ رہ گئے ہیں:

کس توقع پہ کسی کو دیکھیں
کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہو گا
جس کے فنکار کے شہکار ہو تم
اُس نے صدیوں تمہیں سوچا ہو گا
عمر بھر روئے فقط اسی دھن میں
رات بھیگی تو اُجالا ہو گا

فیض احمد فیض رُک رُک کر بڑے آرام سے پڑھتے تھے اور اُن کے لہجہ میں ایک خاص قسم کی مٹھاس اور کشش تھی انہی مشاعروں میں سنی ہوئی ان کی غزل کے دو شعر:

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یونہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی سمجھے کہ بہار آئی
اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
مقتل میں کیا رکھا ہے اے چشمِ تماشائی

حفیظ جالندھری کو بھی انہی مشاعروں میں سنا اُن کا اپنا ہی ایک مخصوص انداز تھا، ترنم سے پڑھتے تھے اور خوب داد لیتے۔ اُن کے ایک دو شعر اب تک یاد ہیں:

نا آشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں
ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

علامہ انور صابری نے بھی ان مشاعروں میں پڑھا اور خوب داد لی۔ اُن کے کچھ شعر ذہن میں آج بھی محفوظ ہیں:

جب سے ہم لوگ نکالے گئے مے خانے سے
دوستی نبھ نہ سکی شیشے کی پیمانے سے
روز الجھتے ہیں اربابِ خرد آپس میں
کوئی دیوانہ الجھتا نہیں دیوانے سے

جگر مراد آبادی کا صرف ایک مطلع اس وقت ذہن میں آ رہا ہے:

حسن کے نغمے بھی خاموش فغاں تک پہنچے
اب تیرے حوصلے اے عشق کہاں تک پہنچے

فراق کا پڑھنے کا انداز فیض کی طرح بڑا منفرد تھا۔ تحت اللفظ پڑھتے۔ جسے بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اُن کی غزل میری یادداشت میں اسی قدر باقی رہ گئی کہ

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات
مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

ہم اہل انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی ، غم تھا تیرا ، ڈھل چکی تھی رات

زہرہ نگاہ کے ترنم کا احساس اب بھی کانوں میں رس گھولتا ہے لیکن ان کا کوئی شعر یاد نہیں رہا اور بھی کئی شعرا تھے جن کا نہ اب نام یاد ہے نہ ہی ان کے شعر۔ بس فقط یہ یاد رہ گیا ہے کہ ساحر صدیقی مشاعرہ لوٹ لے جاتا تھا۔ بڑے بڑے شاعروں کے اہم شعر لوگ بھول جاتے تھے لیکن ساحر کا ترنم سب سے بازی لے جاتا تھا اور کئی دن تک شہر میں موضوع گفتگو بنا رہتا تھا۔ لالہ مرلی دھر شاد کو ساحر اس قدر پسند تھے کہ وہ انہیں دہلی کے مشاعرے میں شرکت کے لیے بھارت لے گیا اور پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا جس میں جھنگ کے اس شاعر نے وہی سماں پیدا کر دیا کہ بڑے بڑے شاعر وہ داد وصول نہ کر سکے جو انھیں وہاں ملی۔ لیکن سانحہ یہ ہے کہ وہ بہت جلد اس دنیا سے اُس دنیا میں چلے گئے۔ اور آج اُن کا ادبی دنیا میں کوئی ذکر تک نہیں کیا جاتا شاید اس لیے کہ وہ ایک غریب خاندان کا غریب فرد تھا اور اس کے پاس وہ ذرائع نہیں تھے جن کے ذریعے انسان بڑا شاعر نہ ہونے کے باوجود بڑا شاعر بن جاتا ہے۔

ان مشاعروں کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے بھی تک بندی شروع کر دی اور اس پہ مزید یہ کہ غالب کی غزل کو سامنے رکھ کے اُسی ردیف اور قافیے میں کچھ کہنے کی کوشش کرتا۔ لیکن جب کوئی بات بن نہ پاتی تو فقط یہ کہتا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اب سوچتا ہوں کہ ان مشاعروں کی وجہ سے اس وقت بھی میری توجہ ادبی دنیا کی طرف ہوئی لیکن ہاکی کھیلنے کا شوق اس قدر زیادہ تھا کہ ادبی شوق و ذوق اُس شوق کے نیچے دب کے رہ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اُنہی دنوں میں نے ایک افسانہ بھی لکھا جسے میں نے شور صاحب کی بارگاہ میں پیش کیا اور ان سے گزارش کی کہ افسانہ دیکھ کر مجھے بتائیں کہ کیا میں افسانے لکھ سکتا ہوں۔ انہوں نے دو روز کے بعد میرا افسانہ مجھے واپس کرتے ہوئے کہنے لگے:

''ابھی تم افسانے پڑھو اس کے بعد افسانے لکھنا''

بس پھر کیا تھا میں نے کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے پڑھ ڈالے لیکن افسانہ لکھنے کی جرأت کبھی نہ کر سکا۔ البتہ جب میں گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان میں پہنچا تو ایک دن میں نے پروفیسر عبدالخالق عزمی کو جو کالج میگزین کے انچارج تھے اُنہیں وہ افسانہ دکھایا تو کہنے لگے اس میں کیا قباحت ہے ٹھیک تو ہے اسے میں کالج کے میگزین میں شائع کر دوں گا۔ چنانچہ میری زندگی کا اکلوتا افسانہ کالج کے میگزین میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''خواب''

ان مشاعرں کی بات اس لیے بھی یاد آئی کہ بعد میں جب میں ریٹائر ہونے کے قریب تھا غالباً ۹۳۔۱۹۹۲ء کی بات ہے میں نے شعر کہنے شروع کیے تو غالباً یہ انہی مشاعروں کی وجہ سے ممکن ہوا یعنی میں نے ایف اے اور بی اے کے دوران جو مشاعرے دیکھے سنے اُن کے اثرات ۹۳۔۱۹۹۲ء میں ظاہر ہوئے جب میں ریٹائر ہونے کے قریب تھا۔ اور آج غزلوں کی ایک کتاب ''خواب خواب روشنی'' چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ستر اسّی کے قریب نعتیں بھی کہنے کی بھی توفیق حاصل ہوئی ہے اور غزلوں کی تعداد تو خاصی زیادہ ہو چکی ہے جو ابھی کتاب کی شکل میں منصۂ شہود پر اس لیے نہ آ سکیں کہ

اس کے لیےضروریات سے زائد رقم درکار ہے اور ہمارا معاملہ یہ ہے کہ: ''چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟''

ادب اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور عموماً یہی ہوتا ہے کہ ادب ہار جاتا ہے اور غربت جیت جاتی ہے۔ پیسے ہوں تو عموماً چھوٹا شاعر بڑا ہو جاتا ہے اور اگر جیب میں پیسے نہ ہوں تو پھر ساحر صدیقی کی طرح کئی شاعر علم و ادب کی دنیا میں داخل ہو کر کہیں ایسے گُم ہو جاتے ہیں جن کا ذکر بھی نہیں ملتا۔

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مختصر سی ملاقات:

غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں زیر تعلیم تھا کالج کی ہاکی ٹیم کے ہمراہ ملتان جانا ہوا۔ ملتان میں ہمارا قیام کالج کے ہوسٹل میں تھا۔ جہاں چند قدموں کے فاصلے پر حضرت شاہ جی کا رہائش گاہ تھی۔ آپ سے ملاقات کا شوق بے چین کیے ہوئے تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ شاہ جی کے پاس حاضر ہو گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے شاہ جی کی ہی آواز آئی آ جایئے۔ چنانچہ میں اپنے ساتھیوں کے ستاپ اندر بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ آپ زمین پر تشریف فرما تھے۔ چند افراد بیٹھے تھے۔ یہ غالباً ان دنوں کی بات ہے جب آپ پر فالج کا پہلا حملہ ہو چکا تھا۔ کمزوری کے علاوہ گفتگو میں فالج کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن چہرہ ویسے ہی شگفتہ اور طبیعت پر کوئی ملال نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ میرا بیٹا کہاں سے آ گیا ہے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ کے ملتان والوں سے ہاکی میچ کھیلنے آیا ہوں۔ فوراً سرائیکی زبان کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ''اچھا توں ہن اساں ملتانیاں کوں ہراون آ گئیں۔ اینویں نہ تھیسی۔'' (اچھا تو اب تم ہم ملتانیوں کو ہرانے کے لیے آ گئے ایسا نہیں ہوگا) جس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے طبیعت کا پوچھا فرمانے لگے بھئی طبیعت کا کیا پوچھتے ہو بس میں تمہارے سامنے موجود ہوں دیکھ لو اب میرا جسم میرے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ، آنکھیں، زبان غرضیکہ جسم کا ایک ایک عضو میری رعایا ہے اور میں اس کا حاکم۔ میں نے اپنی رعایا سے زیادہ کام لیا۔ اتنا زیادہ کہ ان کا بھرکس نکال دیا ہے۔ کیا اب انہوں نے میرے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ چند روز پہلے فالج کا حملہ ہوا تو سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑا مضبوط جسم عطا فرمایا لیکن میں نے ستر برسوں میں اسے بے تحاشا استعمال کیا۔ اب اس میں جسم کا کیا قصور ہے۔ بہر حال میں الحمدللہ! اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہوں شکر ہے اللہ کا جس حال میں رکھے۔ میں خوش ہوں اس کی خوشی میں، اس طرح وقت گزرتا رہا اور ہم باتوں میں مصروف رہے۔ بالآخر میں نے اجازت طلب کی آپ نے مجھے دعاؤں سے رخصت کیا باہر آ کر میں نے دے دی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب ہمارا میچ ہوا تو ہم واقعی ملتانیوں سے میچ ہار گئے۔ اس کے بعد ہم نے ملتان کی ٹیم کے ایک لڑکے جس کا نام مجھے اب تک یاد ہے آفتاب تھا جس کو ملتان والوں نے ناجائز یعنی اصول اور ضابطے کو نظر انداز کر کے اپنی ٹیم میں شامل کیا تھا اس کے خلاف ہم نے ''یونیورسٹی سپورٹس بورڈ'' میں احتجاج رجسٹر کرایا اور فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا۔ چنانچہ ملتان کی ٹیم ٹورنامنٹ سے باہر ہو گئی اور ہمارا اگلا میچ گورنمنٹ کالج ساہیوال سے ہونا قرار پایا۔

پاکستان کے وکٹ کیپر امتیاز سے ملاقات:

گورنمنٹ کالج ساہیوال سے میچ کھیلنے کے لیے ہم ساہیوال پہنچے۔ اس وقت ساہیوال کالج کے ہاکی انچارج آغا امجد علی تھے جنہوں نے بعد میں سول لائنز میں بطور لیکچرار بھی کام کیا اور ہمارے کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ انہوں نے ہمارا ساہیوال پہنچنے پر استقبال کیا اور ہمیں رات گزارنے کے لیے کالج میں ہی ٹھہرایا۔ دوسرے دن میچ تھا پورا شہر کالج کی ہاکی گراؤنڈ پر جمع تھا۔ ساہیوال کالج کی ٹیم پنجاب کے کالجوں میں اچھی خاصی مضبوط ٹیم ہوتی تھی۔ میچ اپنے عروج پر تھا کہ ایک ایسا واقعہ ہوا کہ میچ روکنا پڑا اور ہمیں ساری ہاکی ٹیم کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالہ لگا دیا گیا۔ وجہ تھی کہ میچ کے دوران ایک گول جو حقیقتاً گول نہیں تھا ریفری نے ہمارے خلاف دے دیا۔ بال ہمارے گول کے پیچھے جال کے باہر آ کر لگا اور ریفری نے ہمارے خلاف گول دے دیا۔ ہم نے کہا کہ یہ گول نہیں ہے۔ ہم احتجاج کر رہے تھے اور ریفری ماننے کے لیے بالکل تیار ہی نہیں تھا۔ ساری پبلک گراؤنڈ کے اندر آ گئی۔ میچ بند ہو گیا اور ہمیں ٹیم کے کھلاڑیوں کو مارنے لگ گئے۔ آغا امجد علی اور ہمارا انچارج چودھری غلام رسول نے محنت کے ساتھ ہمیں لوگوں کے چنگل سے چھڑایا اور گراؤنڈ کے ساتھ ہی ایک کمرے میں بند کر دیا۔ باہر سے چودھری صاحب نے تالہ لگا دیا اور کہا کہ ٹیم اس وقت میدان میں آئے گی جب پولیس کا انتظام ہو گا۔ میرے لڑکوں کی زندگی خطرے میں ہے چنانچہ آدھ پون گھنٹہ تک ہم ایک کمرے میں بند رہے۔ پولیس آئی اور میچ دوبارہ شروع ہوا۔ لیکن پولیس کے باوجود لوگ اشتعال میں ہی رہے اور ایسے ماحول میں اچھی کارگردگی کا مظاہرہ نہ کر سکے اور ہو بھی کیسے سکتا تھا ہم تین چار گولوں سے ہار گئے اور بڑے افسردہ ہو کر ساہیوال سٹیشن پر آ گئے۔ جہاں سے ہم نے گاڑی پکڑنا تھی اور خانیوال تک جانا تھا۔ خانیوال سے گاڑی تبدیل کر کے دوسری گاڑی سے لائل پور کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر ہم سب کھلاڑی افسردہ اور پریشان تھے کہ ہمارے ساتھ یہ کیا ہوا ہے؟ لیکن ہمارے انچارج نے مسکراتے ہوئے ہم سے کہا کہ:

''دیکھو میں تم لوگوں کی پرفارمنس سے خوش ہوں اب تم اس پہ زیادہ نہ سوچو، بس جو ہوا ہو گیا شکر کرو کہ کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا اور بچ گئے ہو، میں اس پر ہی خوش ہوں ورنہ اگر معاملہ کنٹرول سے مزید باہر ہو جاتا تو کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔''

اسی اثناء میں گاڑی سٹیشن پر آئی اور ہم سب کمرے میں جگہ تلاش کرنے کے لیے بھاگے تو ہمارے ایک کھلاڑی نے ہمیں کہا کہ وہ دیکھو انٹر کے ڈبے میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے وکٹ کیپر امتیاز بیٹھے ہیں۔ بس پھر کیا تھا امتیاز کا نام سنتے ہی ہم سب کھلاڑی امتیاز کے کمرے میں گھس گئے۔ امتیاز اس وقت اپنی سیٹ پر بڑے آرام سے بیٹھے تھے۔ ہمارے ہاتھ میں ہاکیاں تھیں اُس نے اُٹھ کر ہر ایک سے باقاعدہ ہاتھ ملایا اور گلے لگایا۔ کہا کہ میری ''سپورٹس مین'' برادری آ گئی ہے۔ ہمیں وہ سارا رنج بھول گیا جب ہم نے یہ دیکھا کہ اتنا بڑا آدمی جس کی شہرت بین الاقوامی سطح پر ہے ہمارا اس طرح استقبال کر رہا ہے کہ جیسے ہم اس کے گھر ملنے کے لیے آئے ہوں۔ وہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک پوری ٹیم کے لڑکوں کو اس نے بٹھا نہیں لیا۔ ہم سے پوچھا کیا یہاں پر کوئی میچ کھیلنے کے لیے آئے تھے۔ ہم نے ساری کہانی اسے بلا جھجک سنا دی وہ مسکراتا رہا کہ ہاں بھائی کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔ شکر کرو بچ کر گھر جا رہے ہو۔ (جاری ہے)